© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ششماہی علوم القرآن، علی گڑھ، ۳۰/۱، جنوری - جون ۲۰۱۵ء

اداریہ

اعتدال قرآن وسنت کی روشنی میں

ظفرالاسلام اصلاحی

سب سے پہلے یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ لفظ "اعتدال" کا ماخذ، جیسا کہ معروف ہے، عدل ہے یعنی شخص یا چیز کا جو حق ہے اس کا پورا خیال رکھا جائے یا اسے دیا جائے۔ کسی چیز کے ایک پہلو کو دوسرے پر بلا وجہ غالب نہ ہونے دیا جائے، ورنہ عدل وتوازن کے منافی ہوگا۔ درحقیقت اعتدال ایک ایسی صفت ہے جو انسان کے بہت سے منفی جذبات کو قابو میں رکھتی ہے یا اسے ان کی شدت سے محفوظ رکھتی ہے جس کے اثر سے اس کے جذبات بر انگیختہ نہیں ہوتے اور وہ ایسے کام سے بچ جاتا ہے جو بالآخر خود اس کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی نقصان اور تکلیف کا باعث بنتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ ہو اس سے متعلق فکر وعمل میں اعتدال موجبِ خیر ہوتا ہے اور افراط وتفریط یا بے اعتدالی باعثِ وبال ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں امتِ مسلمہ کی امتیازی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ امت وسط ہے، یعنی اعتدال کا رویہ اپنانے والی یا میانہ روی اختیار کرنے والی۔ دوسرے لفظوں میں انتہا پسندی کی کیفیت یا حالت سے اپنے آپ کو بچانے والی۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا	اور اس طرح ہم نے تم کو ایک "امت
لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۤءَ عَلَى النَّاسِ	وسط" بنایا ہے تاکہ تم سارے انسانوں
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔	کے لیے دین حق کے گواہ بنو اور ہمارے
(البقرہ ۲/۱۴۳)	رسول تمہارے لیے گواہ ہوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بات بڑی اہم ہے کہ بعض مفسرین نے واضح طور پر ''امۃ وسط'' کا مطلب معتدل امت بیان کیا ہے۔ بعض نے اسے ''خیر امت'' سے تعبیر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ دونوں مفہوم کو جمع کر کے اس کی یہ ترجمانی بہت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جو امت معتدل یا اعتدال پسند ہوگی وہ خیر ہی خیر ہوگی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اسلام کی اس امتیازی خصوصیت کو مذکورہ بالا آیت کے حوالہ سے ان الفاظ میں واضح کیا ہے: ''اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں میں افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مسلمانوں کو ''امۃً وسطاً'' (بقرہ: ۲/۱۴۳) [بیچ کی امت] کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے۔ اسی لیے اس نے اکثر معاملوں میں اعتدال و میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو نہیں بھولا ہے'' (سیرۃ النبی ﷺ، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ۶/۳۳۷)۔ مزید براں بعض ماہرینِ قرآنیات نے اس آیت (قل امر ربّی بالقسط /الاعراف ۷/۲۹) کے حوالہ سے یہ واضح کیا ہے کہ اس میں راستی و انصاف کا جو حکم نبی کریم ﷺ کے توسط سے پوری امت کو دیا گیا ہے، اس میں راہِ اعتدال اختیار کرنا بھی شامل ہے، اس لیے کہ اعتدال عدل کے لوازم میں سے ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے: ''تم کہو! میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ (ہر بات میں) اعتدال کی راہ اختیار کرو''۔ یعنی انھوں نے واضح طور پر ''قسط'' سے اعتدال ہی مراد لیا ہے۔ بلاشبہ اسلامی شریعت پوری کی پوری اعتدال میں رچی بسی ہے، اسی لیے اس شریعت کو صراطِ مستقیم کہا جاتا ہے۔ اسلام کی نظر میں اعتدال زندگی کے ہر شعبہ (عقاید، عبادات، اخلاقیات و معاملات) میں نہ صرف مطلوب ہے، بلکہ اس کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ یہ اسلام کی ایسی بنیادی خصوصیت ہے جو اس کے تمام احکام و تعلیمات میں نمایاں ہے اور اس کو حرزِ جاں بنانے میں سب کی بھلائی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: خیر الامور اوسطها [بہترین معاملات وہ ہیں جن میں میانہ روی اختیار کی جائے] (شاہ ولی اللہ دہلویؒ، چہل حدیث/اردو ترجمہ و تشریح: عبدالماجد دریابادی، حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی پھلت، بدون تاریخ، ص ۱۴)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نزولِ قرآن کے وقت عقاید کے باب میں ایک جانب یہ بے اعتدالی تھی کہ انسانوں کے ایک گروہ نے ان گنت معبود و مسجود بنا رکھے تھے، جن میں سورج، چاند، ستارے، پیڑ، پودے، پہاڑ، پتھر اور جانور سب کچھ شامل تھے۔ دوسری جانب یہ بھی انتہا تھی کہ ایک جماعتِ انسانی نے سرے سے اللہ یا اس کائنات کے خالق و مالک کے وجود کا انکار کردیا، جب کہ دوسری نے خدائی کا دعویٰ کر کے اپنے کو الوہیت کے مقام پر پہنچادیا اور لوگوں کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے کے لیے مجبور کردیا۔ اسلام نے ان سب نقطہ ہائے نظر کو باطل ٹھہرادیا، جیسا کہ قرآن کے اس برملا اعلان سے واضح ہوتا ہے:

إِلَـٰهُكُمْ إِلَـٰهٌ وَاحِدٌ لَّا إِلَـٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَـٰنُ الرَّحِيمُ (البقرہ ۲/۱۶۳)	تمھارا خدا صرف ایک خدا ہے۔ اس رحمٰن و رحیم کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں

اور پھر انسان کو صاف صاف لفظوں میں یہ حکم دیا گیا:

لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلَّـهِ الَّذِي خَلَقَهُنَّ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ (حٰم السجدہ ۴۱/۳۷)	نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو، بلکہ اللہ ہی کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا اگر تم واقعی اس کی عبادت کرنے والے ہو
وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ (بنی اسرائیل ۱۷/۲۲۔۲۳)	اور تیرے رب نے فیصلہ کردیا ہے کہ کسی کی عبادت نہ کرو، صرف ایک اللہ کی عبادت کرو

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ دینِ اسلام کے مطالبات کا خلاصہ حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی ہے۔ قرآنی آیات میں غور وفکر سے یہ صاف واضح ہوتا ہے کہ جگہ جگہ ان میں اعتدال و توازن قایم رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ کے حقوق کی ادائیگی کی ہدایت کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنے کی یاد دہانی کرائی گئی ہے (النساء ۴/۲، الانعام ۶/۱۴، الروم ۳۰/۳۸، الذاریات ۵۱/۱۹، المعارج ۷۰/۲۵) اور بعض مقام پر تو اللہ نے اپنی عبادت کے حکم کے فوراً بعد والدین، اقرباء، پڑوسی اور سماج کے کمزور طبقات (غرباء، مساکین، یتامیٰ، مسافروں، غلاموں و خادموں) کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے یا نیک سلوک کی ہدایت دی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں یہ واضح رہے کہ کسی کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کا لازمی تقاضا اس کے واجبی حقوق کی ادائیگی ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا	اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی
وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى	اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین،
وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَارِ ذِى	قرابت مندوں، یتامیٰ، مساکین،
الۡقُرۡبٰى وَالۡجَـارِ الۡجُـنُبِ وَالصَّاحِبِ	قرابت دار پڑوسی اور اجنبی پڑوسی، مسافر
بِالۡجَـنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ وَمَا مَلَـكَتۡ	اور اپنے مملوک کے ساتھ اچھا سلوک
اَيۡمَانُكُمۡ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ	کرو۔ بے شک اللہ اترانے والوں اور
مُخۡتَالًا فَخُوۡرًا (النساء۳۶/۴)	غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

اسلام میں دونوں قسم کے حقوق میں توازن واعتدال برتنے پر زور دینے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام رہبانیت (تمام خاندانی، سماجی، معاشی وسیاسی علائق ومطالبات سے کنارہ کش ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرلینا) کا سخت مخالف ہے (الحدید: ۲۷/۵۷)۔ اسلام انسان کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے جس میں مذہبی و مادّی تقاضوں میں توازن برقرار رہے اور دینی فرایض کی تکمیل کے ساتھ دنیوی ضروریات پوری کرنے کی فکر وکوشش جاری رہے یا بالفاظِ دیگر حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد کی پاسبانی ہوتی رہے۔ اسلام دنیوی مصروفیات (خواہ سماجی ہوں یا معاشی یا کوئی اور) سے منع نہیں کرتا، اور منع بھی نہیں کرسکتا، اس لیے اسلامی نقطۂ نظر سے یہ دنیا آخرت کی تیاری کے لیے ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا فرمان بہت مشہور ہے: الدنیا مزرعة الآخرة /دنیا آخرت کی کھیتی ہے یعنی اس کی مصروفیات میں رہ کر (نہ کہ اس سے کنارہ کش ہوکر) دوسری زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ درحقیقت اسی میں انسان کی اصل آزمائش ہے اور اسی مقصد سے اس دنیا میں اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ البتہ یہ اہتمام ضروری ہے کہ اس زندگی کی مصروفیات کو اس طور پر جاری رکھا جائے کہ اخروی زندگی کی تعمیر اور اس کی فلاح متاثر نہ ہو، بلکہ اس مقصد کا حصول مقدم رہے۔ قرآن کریم کی اس آیت سے یہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نکتہ اخذ ہوتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

وَابْتَغِ فِيْمَا آتَاكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ (القصص: ۲۸/۷۷)

اور جو کچھ اللہ نے تجھے عطا کیا ہے، اس میں آخرت کا گھر طلب کرو اور اپنے دنیوی حصہ کو [لینا] نہ بھولو۔ احسان کرو [لوگوں کے ساتھ] جیسے اللہ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں معاد و معاش (یعنی معاد کی بہتری کی طلب اور معاش کے حصول) میں اعتدال و توازن قایم رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ اخروی زندگی کی بہتری و کامیابی بہر حال پیش نظر اور مقدم رہے۔ آیت کے آخری حصہ سے یہی پیغام ملتا ہے کہ دنیا کی جو چیز بھی حاصل ہو اسے اپنے فائدہ میں استعمال کرنے کے علاوہ دوسروں کو بھی اس سے نفع پہنچا کر اخروی زندگی کی تعمیر کا سامان بہم پہنچایا جائے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک دفعہ گجرات میں تجار کے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے اسی نکتہ کو بڑے موثر و بلیغ اسلوب میں ان الفاظ میں واضح کیا تھا: ''یہ دنیا اسی لیے دی گئی ہے کہ یہاں رہ کر اُس دنیا کا سودا کیجیے۔ آپ جس طرح افریقہ اور برما میں رہ کر رانڈیر کو آباد کرتے ہیں، اُسی طرح دنیا میں سودا کر کے آخرت کی آبادی کی فکر میں رہیں۔ اِس دنیا میں رہ کر اور اِس دنیا کے کاروبار کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق انجام دے کر اور خواہشاتِ دنیا سے بچ کر اطاعتِ الٰہی کی تعمیل کر کے معرفتِ الٰہی اور رضائے الٰہی کی جو سرفرازی پائیں، تو یہی مجاہدہ ہے جو آدمؑ اور بنی آدم کے لیے مخصوص ہوا ہے اور جو فرشتوں کے حدود سے خارج ہے'' (علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تفسیری نکات، مرتبہ محمد فرمان ندوی، مجلس تحقیقات و نشریاتِ اسلام، لکھنؤ، ۲۰۱۵ء، ۱/۲۱۵)۔

مومنین کس طور پر اس دونوں فکر کو اوڑھے رکھتے ہیں اور ان کی تعمیر میں توازن برتتے ہیں، قرآن میں ان کی یہ کیفیت اس آیت میں بیان کی گی ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلوٰةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكوٰةِ (النور ۲۴/۳۷)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد، نماز کے اہتمام اور زکواۃ کی ادائیگی سے غافل نھیں کرتی

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی کہ اللہ تعالٰی نے قرآن کریم ہمیں دنیا و آخرت دونوں جہاں کی بھلائی کی طلب کے لیے دعا (رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ /البقرۃ/۲۰۱) کی ہدایت دی ہے، لیکن یہی کتاب ہدایت اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ پہلی موخر اور دوسری مقدم یا پہلی مرجوح اور دوسری راجح ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ارشاد خداوندی ہے:

بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا. وَالآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى (الاعلیٰ ۸۷/۱۶-۱۷)

لیکن تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو اور [حقیقت یہ ہے کہ] آخرت [اس سے] بہتر اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے

واقعہ یہ کہ ایک مومن کے لیے دنیا کی بھلائی صحیح معنوں میں اسی وقت بھلائی کہلائے گی جب اس سے دوسری یا ابدی دنیا کی بھلائی کے لیے راہیں ہموار ہو جائیں۔

اسلام کے معتدلانہ مزاج کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ خالصۃً مذہبی معاملات یا عبادات میں بھی بے اعتدالی یا عدم توازن کو گوارا نھیں کرتا، خاص طور سے اس صورت میں جب کہ اس سے زندگی کے دوسرے تقاضوں کی تکمیل یا دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ سیرتِ نبوی ﷺ کے اس واقعہ سے اسی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ حضرت انس ابن مالکؓ کی بیان کردہ یہ روایت بہت مشہور ہے کہ تین صحابیوں کے ازواج مطہرات سے نبی کریم ﷺ کی عبادات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر جب انھیں یہ محسوس ہوا کہ یہ تو بہت کم ہے اور انھوں نے یہ سوچا کہ ان کا آپ ﷺ سے کیا موازنہ؟۔ آپ ﷺ کے اگلے اور پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ رات بھر نمازیں پڑھتے رہیں گے (اور سوئیں گے نھیں) اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسرے نے یہ کہا کہ وہ ہمیشہ بلا ناغہ روزہ رکھیں گے اور تیسرے نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا تہیہ کیا۔ جب نبی اکرم ﷺ کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو کہا خبردار! ہرگز ایسا نہ کرنا۔ میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سے زیادہ متقی ہوں۔ میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں (یعنی کبھی نہیں بھی رکھتا ہوں)، (رات میں) نمازیں پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو شخص میری سنت سے انحراف کرے گا وہ میری امت میں سے نہیں (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصد والمداومة علی العمل)۔

اسی طرح کی ایک دوسری روایت زیر بحث معاملہ کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو بن عاصؓ زاہدانہ و متقیانہ زندگی کے لیے معروف تھے۔ ایک بار انھوں نے یہ طے کر لیا کہ ہمیشہ دن میں روزہ رکھیں گے اور شب میں عبادت میں مصروف رہیں گے۔ حضور اقدس ﷺ کو خبر ہوئی تو انھیں بلا کر پوچھا: کیا یہ خبر صحیح ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، روزہ رکھو اور افطار بھی کرو، رات میں عبادت کرو اور سوؤ بھی، اس لیے کہ تمھارے جسم کا تم پر حق ہے، تمھاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمھاری بیوی کا تم پر حق ہے، تمھارے مہمانوں کا تم پر حق ہے اور (بعض روایت میں اضافہ کے مطابق رتمھارے گھر والوں کا تم پر حق ہے)۔ تمھارے لیے مہینہ میں تین دن روزہ رکھنا کافی ہے (صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم الدھر)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اعتدال کا تصور کتنا جامع و وسیع ہے کہ عبادت میں بھی اس کا پورا پورا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ عبادت میں مصروف رہنے کا مجوزہ طریقہ بے اعتدالی پر مبنی تھا۔ اس میں خود اپنے اعضاء جسم کی حق تلفی تھی اور دوسروں کے حقوق کی بھی عدم رعایت مضمر تھی، اسی لیے آپ ﷺ نے انھیں اپنا ارادہ یا فیصلہ بدلنے کی ہدایت دی۔

عبادات میں نماز سے افضل کون سی عبادت ہوسکتی ہے۔ زیر بحث موضوع کے لحاظ سے یہ بات بھی کافی اہمیت رکھتی ہے کہ قرآن و حدیث میں نماز سے متعلق مختلف اعمال میں اعتدال برتنے کی واضح ہدایات دی گئی ہیں۔ قراءتِ قرآن نماز کے فرائض میں سے ہے، اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باب میں قرآن میں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ نماز میں نہ تو بہت بلند آواز سے قراءت کی جائے اور نہ بالکل پست آواز میں، بلکہ بیچ کی صورت اختیار کی جائے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ	اور اپنی نماز نہ زیادہ بلند آواز سے پڑھیے
بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا	اور نہ بالکل ہی دھیرے دھیرے۔ بلکہ
(بنی اسرائیل ۱۷/۱۱۰)	دونوں کے درمیان کا طریقہ اختیار کیجیے

صاحب ''تدبر قرآن'' مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کی تشریح میں تحریر فرماتے ہیں: ''حکم ہوا کہ تمھاری نمازیں و دعائیں بہت زیادہ جہری نہ ہوں، نہ بالکل سرّی۔ تمھاری نمازوں و دعاؤں میں بھی امتِ وسط کی شان نمایاں ہونی چاہیے'' (قرآن کریم مع ترجمہ اور اخذ و تلخیص تفسیر تدبرِ قرآن، مرتبہ: خالد مسعود، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، ۲۰۰۰، ص ۴۶۰)۔ حضرت ابو بکر الصدیقؓ اور حضرت عمر الفاروقؓ سے متعلق یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ اول الذکر تہجد کی نماز میں دھیمی آواز سے قرآن پڑھتے تھے اور ثانی الذکر کافی بلند آواز سے۔ آپ ﷺ نے اس کی وجہ دریافت کی تو دونوں حضرات نے اپنے اپنے طور پر اس کی وضاحت کی۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنی آواز کچھ بلند کرنے کی ہدایت دی اور حضرت عمرؓ سے اپنی آوز کچھ پست کرنے کے لیے فرمایا (مجیب اللہ ندوی، اسوۂ حسنہ، تاج کمپنی، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۵۲۔۲۵۳)۔ یہاں یہ ذکر برمحل معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو جب ایک صحابی کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ نماز پڑھاتے ہیں تو بہت لمبی قراءت کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے اس پر ناگواری ظاہر کی اور مسجد نبوی ﷺ کے منبر سے علانیہ یہ ہدایت جاری کی کہ ''جو شخص امامت کرے، وہ ہلکی نماز پڑھائے، کیوں کہ نماز میں بوڑھے، مریض اور حاجت مند لوگ بھی ہوتے ہیں'' (صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ باب اذا تحول الامام و کان للرجل حاجۃ)۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ دعا کو مخ العبادۃ (عبادت کا مغز) کہا گیا ہے اور نماز کے اندر اور باہر ہر حال میں دعا و ذکر الٰہی مطلوب ہے اور ہر مومن اس میں مصروف رہنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ دعا دل میں چپکے چپکے مانگی جا سکتی ہے اور آواز کے ساتھ بھی، لیکن دوسری صورت میں قرآن نے اعتدال برتنے کی تعلیم دی ہے۔ اللہ ربّ العزت کا ارشاد ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ	اور اپنے رب کو صبح و شام یاد کیجیے دل ہی دل
تَضَرُّعاً وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ	میں گڑگڑاتے ہوئے اور اس سے خوف
الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالآصَالِ	کھاتے ہوئے اور پست آواز سے بھی
(الاعراف ۲۰۵/۷)	

صاحبِ ''معارف القرآن'' مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ "دون الجھر" کی تفسیر میں رقم طراز ہیں: ''یعنی زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔ یعنی ذکر اللہ میں مشغول ہونے والے کو یہ بھی اختیار ہے کہ آواز سے ذکر کرے، مگر اس کا ادب یہ ہے کہ بہت زور سے چیخ کر نہ کرے، متوسط آواز کے ساتھ کرے جس میں ادب و احترام ملحوظ رہے'' (معارف القرآن، مکتبہ مصطفائیہ دیوبند، بدون تاریخ، ۱۶۶/۴)۔

''انفاق'' قرآن کریم کی ایک معروف اصطلاح ہے جس سے مراد اپنے مال و اسباب سے کسی ضرورت مند کی مدد کرنا یا کسی کار خیر میں مال کو خرچ کرنا ہے۔ صدقہ و خیرات کرنا بھی اس میں شامل ہے جسے بجا طور پر نفلی عبادت کہا جاتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں اس کی فضیلت بیان کی گئی اور اس پر اجر کثیر کا وعدۂ الٰہی مذکور ہے، لیکن اس باب میں بھی قرآن و حدیث میں اعتدال و میانہ روی کی تاکید ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انفاق میں بھی اعتدال کی راہ پسند کرتا ہے۔ نہ تو صاحبِ مال سے یہ چاہتا ہے کہ وہ سب کچھ لٹادے اور خود آخر میں محتاج و درماندہ بن کر رہ جائے اور نہ اس کی نظر میں یہ مطلوب ہے کہ وہ مال خرچ کرنے سے ہاتھ کو اس طرح روکے رکھے کہ اپنی ضروریاتِ واجبہ بھی نہ پوری کر سکے۔ ارشادِ ربانی ہے:

ولا تجعل یدک مغلولة الیٰ	اور نہ اپنے ہاتھ کو گردن میں باندھے
عنقک ولا تبسطھا کل	رکھو [کہ کسی کو کچھ دو ہی نہ] اور نہ
البسط فتقعد ملوماً محسوراً	اپنے ہاتھ کو بالکل کھلا چھوڑ دو [کہ
(بنی اسرائیل ۲۹/۱۷)	سب کچھ دے ڈالو] اور ملامت زدہ
	و عاجز بن کر رہ جاؤ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں ایک حدیث کے حوالہ سے اس نکتہ کو مزید واضح کیا جا سکتا ہے۔ حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اصحاب ثروت صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ بیمار ہوئے تو نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کو تشریف لے گئے تو انھوں نے اپنا پورا مال صدقہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نھیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک تہائی صدقہ کر سکتے ہو اور انھیں یہ بھی نصیحت کی کہ تم اپنے ورثہ کو مالدار چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے تم انھیں اس حالت میں چھوڑو کہ وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کریں (سنن ابو داؤد، کتاب الوصایا، باب ما جاء فیما یجوز للموصی)۔

ان تمام تفصیلات سے یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب دین اسلام میں عبادات کے باب میں اعتدال وتوازن سے کام لینے کی اس قدر تاکید ملتی ہے تو زندگی کے دیگر معاملات میں اعتدال سے متعلق اس کی ہدایات وتعلیمات کس درجہ اہم اور موکد ہوں گی۔ ذیل کی تفصیلات سے یہ نکتہ مزید واضح ہو جائے گا۔

اوپر یہ ذکر آ چکا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کی رو سے انفاق (جس سے عام طور پر صدقہ وخیرات یا کسی نیک کام میں مال خرچ کرنا مراد لیا جاتا ہے) میں بھی اعتدال کا رویہ مطلوب ہے، اس لیے کہ اس میں بے اعتدالی سے انفاق کرنے والے کا نقصان ہوتا ہے اور اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی بھی متاثر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ کہ انفاق یا مال خرچ کرنے کے بارے میں اعتدال برتنے کی قرآنی تعلیم روزمرہ زندگی میں دوسرے معاملات میں بھی مطلوب ہے۔ قرآن میں مومنین صالحین یا اللہ کے نیک بندوں کی ایک خاص صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ مال خرچ کرنے میں میانہ روی کا رویہ اپناتے ہیں، یعنی فضول خرچی وبخل دونوں سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا
(الفرقان: ۲۵/۶۷)

اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ تنگی وبخل سے کام لیتے ہیں بلکہ ان کے درمیان بیچ کی راہ اختیار کرتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سیاق وسباق سے یہی ظاہر ہورہا ہے کہ اس آیت میں انفاق یا مال خرچ کرنا ایک وسیع مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اسے صرف انفاق فی سبیل اللہ تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔ دوسرے قرآن کریم میں فضول خرچی، حرص اور بخل کی مذمت کرتے ہوئے ان سب بری عادتوں سے دور رہنے کی ہدایت دی گئی ہے، اس لیے کہ یہ خصائلِ مذمومہ کسبِ مال وصرفِ مال کے باب میں غیر معتدل رویہ کے مظہر ہیں اور یہ ایسی خطرناک بیماریاں ہیں جو معیشت و معاشرت دونوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ بلاشبہ مال کی محبت انسان کی فطرت میں داخل ہے اور جب یہ محبت حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے یعنی اس میں بے اعتدالی آجاتی ہے تو انسان کے دل میں حرص وطمع جیسی برائیاں جنم پاتی ہیں جو اسے بالآخر مال خرچ کرنے سے روکتی ہیں۔ پھر اسی سے بخل جیسی مذموم صفت پروان چڑھتی ہے اور یہ اس انتہا تک پہنچ جاتی ہے کہ ایسا شخص دوسروں کو بھی بخل پر ابھارتا ہے۔ واقعہ یہ کہ یہ بے اعتدالی کا ایک رویہ ہے جس میں خیر ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی لیے قرآن حرص وبخل سے باز رہتے ہوئے احسن طریقہ سے مال خرچ کرنے کی بار بار تاکید کرتا ہے اور صاحبِ مال کے ذہن میں یہ نکتہ جاگزیں کرتا ہے کہ اسی میں اس کی بھلائی وکامیابی ہے اور دوسروں کے لیے نفع رسانی بھی۔ یہ آیت اسی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہی ہے:

وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْراً لِّأَنفُسِكُمْ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (التغابن: ۱۶/۶۴)	اور سنو وفرماں برداری بجالاؤ اور [اپنے مال کو نیک کاموں میں] خرچ کرو۔ یہ تمہارے لیے باعث خیر ہے اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچالیے گئے وہی کامیاب ہیں

یہاں یہ وضاحت اہمیت سے خالی نہ ہوگی لفظ "شحّ" حرص وبخل دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، جیسا کہ اس آیت کے ذیل میں مختلف مترجمین ومفسرین کی تشریحات سے واضح ہوتا ہے۔ درحقیقت حرص کا لازمی نتیجہ بخل ہوتا ہے۔ اس کی تائید اس حدیث سے بھی ملتی ہے جس میں حرص کی مذمت کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجب ہلاکت ہے اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا بخل انسانی رشتوں کو کاٹتا ہے اور رشتہ داروں سے تعلقات کو خراب کرتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار خطبہ میں ارشاد فرمایا:

ایاکم والشح فان الشح ھلک من کان قبلکم ۔ امرھم بالقطیعة فقطعوا ، امرھم بالبخل فبخلوا و امرھم بالفجور ففجروا (مسند احمد ابن حنبل ،المطبعة المیمنیة ،مصر ۱۳۱۳ھ، ۲/ ۱۵۹ـ ۱۶۰)

(حرص سے بچو، اس لیے کہ حرص نے تم سے پہلے کے لوگوں کو ہلاک کیا۔ لالچ نے انھیں رشتہ داروں سے ناتہ توڑنے پر ابھارا تو انھوں نے رشتہ منقطع کرلیا، انھیں بخل کا حکم دیا، سوانھوں نے بخل کیا، اس نے انھیں برائی پر اکسایا تو وہ برائی میں ملوث ہوگئے)

مال خرچ کرنے کے باب میں غیر معتدل رویہ کو بڑھاوا دینے والی یہ بیماری (بخل) انسان کے لیے کس قدر وبالِ جان بنتی ہے یا بنے گی اس کا اندازہ آل عمران کی اس آیت (نمبر۔۱۸۰) سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اللہ رب العزت نے بخل کرنے والوں کو صاف صاف اس طور پر متنبہ کیا ہے کہ "جو لوگ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ ان کے لیے خیر یا بہتر ہے، (حقیقت یہ کہ) یہ ان کے حق میں (انجام کے لحاظ سے) بری شئی ہے"۔

یہاں یہ بھی واضح رہے کہ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اسراف (فضول خرچی) کی مذمت اور ممانعت مذکور ہے۔ اگر اس پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ اس ممانعت سے دیگر خرابیوں (مال کا ضیاع، مستحقین ومحتاجوں کی حق تلفی وغیرہا) کے ازالہ کے علاوہ آمد وصرف میں عدمِ توازن سے روکنا بھی مقصود ہے، اس لیے کہ بسا اوقات مسرف یا فضول خرچی کرنے والا اپنی آمدنی یا وسعت سے زیادہ مال و دولت لٹا دیتا ہے اور اس بے اعتدالی کی وجہ سے اس کی معاشی حالت ابتر ہو جاتی ہے اور یہی بے اعتدالی اگر اجتماعی طور پر یا حکومت کی سطح پر کی جاتی ہے تو پورا معاشرہ اس سے متاثر ہوتا ہے اور متعلقہ حکومت مالی بحران کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اقتصادی نظام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور معاشی زندگی کے اصول وضوابط میں آمد وصرف میں توازن پر بہت زور دیا جاتا ہے اور عصر حاضر کے ماہرین معاشیات یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اصول جدید معاشیات کی دین ہے۔ حقیقت یہ کہ اقتصادیات کا یہ بنیادی اصول سب سے پہلے قرآن نے عطا کیا جسے نبی اکرم ﷺ نے اپنے قول وعمل سے مزید واضح ومبرہن کیا۔ آپ ﷺ نے کتنے عمدہ اور موثر انداز میں اس اصول کو بیان فرمایا: **الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة** (مشکوٰۃ المصابیح، باب التأنی والحذر، منشورات المکتب الاسلامی، دمشق، ۱۹۶۱ء، ۶۲۷/۲) (خرچ کرنے میں میانہ روی نصف معیشت ہے) یعنی آدھی معاشیات مال خرچ کرنے میں میانہ روی یا اعتدال کا رویہ اپنانے پر مبنی ہے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک اور حدیث روایت کی گئی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ معیشت میں میانہ روی اختیار کرنا آدمی کے عقلمند ہونے کی دلیل ہے (محمد فاروق خاں، کلام نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء، ۱۰۹/۴)۔ واقعہ یہ کہ حضور اقدس ﷺ کے ان اقوال شریفہ و بلیغہ کی کی تشریح وترجمانی کے لیے ورق کے ورق سیاہ کیے جائیں تو بھی ناکافی ہوں گے۔ مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے محولہ بالا پہلی حدیث کے حوالے سے بہت صحیح تبصرہ فرمایا ہے:

"جس طرح آپ ﷺ نے عبادات میں، معاملات میں توازن واعتدال کی تعلیم دی، اسی طرح اقتصادیات کے معاملہ میں اعتدال وتوازن قایم رکھنے کا جو طریقہ بتایا وہ ایک ایسی کلید ہے جس کو خوشحالی کا راز کہا جاسکتا ہے"۔ (فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، نبی رحمت ﷺ کی تعلیم وتربیت میں حسنِ اعتدال، ماہنامہ راہ اعتدال [عمراباد] اعتدال نمبر، ۲/۶، اکتوبر، ۲۰۰۵ء، ص ۹۹)۔

اسی ضمن میں یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ نامور مفکر اور عظیم مصلح شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۲ء) نے اپنی دعوتِ رجوع الی القرآن والسنہ کا مخاطب مسلم معاشرہ کے مختلف طبقات کے لوگوں کو بنایا۔ اہلِ حکومت اور عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مشاہدات وتجربات کی روشنی میں معاشرتی انحطاط اور حکومت کے زوال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اسباب کی نشان دہی کی اور قرآن وحدیث کے حوالے سے ان کے ازالہ کی تدابیر بھی بتائیں۔ اہم بات یہ کہ انھوں نے مسلم حکومت کے زوال کی ایک بہت بڑی وجہ مالی بحران کو قرار دیا اور اس بحران کا اصل سبب حکومت اور اہل حکومت، اہل صنعت وحرفت اور عام لوگوں کے آمد وصرف میں عدم توازن کو بتایا اور ان سب کو اس جانب متوجہ کرتے ہوئے اس باب میں اصلاحی اقدامات کی نصیحت کی (شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، التفہیمات الالٰہیہ، مجلس علمی، ڈابھیل (گجرات)، ۱۹۳۶ء، ۲۱۶/۱۔ ۲۱۸)۔

یہاں یہ اضافہ بھی بے موقع نہ ہوگا کہ قرآن کریم میں (جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا) اسراف کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔ اس ممانعت کا ایک پہلو تو وہ ہے جس کا ذکر آیا یعنی آمد وصرف میں عدم توازن سے احتراز۔ اسی کے ساتھ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اسراف کی ممانعت کا سب سے واضح پہلو کھانے پینے یا روزمرہ زندگی میں مختلف اشیاء کے بے جا یا غیر ضروری استعمال سے اپنے آپ کو دور رکھنا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی چیز کا بے جا یا غیر ضروری استعمال بے اعتدالی کی کیفیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس باب میں سورہ الاعراف کی یہ آیت کلیدی حیثیت رکھتی ہے، جسے پہلے بھی نقل کیا جاچکا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الاعراف: ۷/۳۱)	کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو بے شک وہ (اللہ) فضول خرچی کرنے والوں کو پسند بھی کرتا

اس آیت میں گرچہ خاص طور سے کھانے پینے میں اسراف یا فضول خرچی سے منع کیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ کہ یہ آیت اپنے مفہوم کے لحاظ سے بڑی جامع ہے۔ دراصل اس میں ان تمام چیزوں کے بے جا یا غیر ضروری استعمال کی ممانعت شامل ہے جن سے انسان روز مرہ زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن کریم کی اس آیت میں معاشی زندگی میں مختلف پہلوؤں سے اعتدال برتنے اور حد سے تجاوز کرنے (جو اسراف کا لازمہ ہوتا ہے) سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ مذکورہ آیت سے سب سے قیمتی سبق یہ ملتا ہے کہ اللہ رب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

العزت نے ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے جونعمتیں عطا کی ہیں یا جواسباب مہیا کیے ہیں ان کا استعمال نہ صرف جائز ہے بلکہ مطلوب ہے، لیکن اس استعمال میں اسراف نہ ہو یعنی ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے میں اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، اس لیے کہ ایسا کرنا نعمت کا ضیاع ہے محتاجوں کی حق تلفی ہے اور خود اپنا نقصان ہے اور ان سب سے سنگین یہ کہ منعمِ حقیقی کی ناشکری ہے۔ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں صاحبِ ''ترجمان القرآن'' مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو قیمتی نکات پیش کیے ہیں انھیں یہاں نقل کرنا بہت برمحل معلوم ہوتا ہے۔ خود ان کے الفاظ میں:

''خدا نے زمین میں جو کچھ پیدا کیا ہے سب تمھارے ہی لیے پیدا کیا ہے۔ کھاؤ پیو، زینت و آرائش کی تمام نعمتیں کام میں لاؤ، مگر حد سے نہ گذر جاؤ۔ دنیا نھیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے۔ یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں الٹ دیں۔ وہ دنیا جو نجات و سعادت کی طلب میں دنیا ترک کر رہی تھی، اب اسی نجات و سعادت کو دنیا کی تعمیر و ترقی میں ڈھونڈنے لگی''۔ (ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادیمی، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء، ۲۰/۳)۔

حقیقت یہ کہ مولانا آزاد کا یہ قول (دنیا نھیں، دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال روحانی سعادت کے خلاف ہے) دنیا کے مال واسباب کے تئیں قرآن کے واضح نقطہ نظر کا خلاصہ اور اس کی اعتدال پسندی کی ایک جامع ترجمانی ہے۔

مختصر یہ کہ نہ صرف یہ کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق قرآن وسنت میں اعتدال و میانہ روی اختیار کرنے کی تعلیم ملتی ہے، بلکہ انسان کو یہ باور بھی کرایا گیا ہے کہ یہ رویہ ایک جانب خود اپنانے والے کے لیے موجبِ خیر و فلاح ہے اور دوسری جانب اس کے آس پاس رہنے والے یا اس کے ساتھ روزمرہ زندگی بسر کرنے والے بھی اس کے فیض سے راحت و سکون محسوس کرتے ہیں۔

معاشی زندگی میں اعتدال سے متعلق قرآن وسنت کی تعلیمات کے علاوہ معاشرتی زندگی میں اعتدال برتنے کے بارے میں بھی ان کی ہدایات وتعلیمات ملتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں خاص طور سے چلنے پھرنے، بولنے ہنسنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، خوشی وغم کے اظہار، دوستی ودشمنی، تعریف وتنقید جیسے معاملات کے حوالے سے متعلقہ آیات واحادیث کی تشریح وترجمانی مقصود ہے۔

انسان صبح سے شام تک اپنے کاموں کے سلسلہ میں چلتا پھرتا رہتا ہے۔ اس کی چال کیسی ہو؟ اس باب میں قرآن کی بہت ہی واضح ہدایت ہے:

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِکَ وَاغْضُضْ مِن صَوْتِکَ (لقمان: ۳۱/۱۹)

اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز کو پست رکھو

اس آیت کی تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں: ”نہ بہت دوڑ کر چلو کہ وقار کے خلاف ہے، نیز گر جانے کا بھی احتمال ہے اور نہ بہت گن گن کر قدم رکھ کہ وضعِ متکبرین کی ہے، بلکہ بے تکلف اور متوسط رفتار تواضع وسادگی کے ساتھ اختیار کر، جس کو دوسری آیت میں اس عنوان سے ”یمشون علی الارض ھوناً“ (اور وہ [رحمان کے بندے] میانہ روی سے چلتے ہیں) ذکر کیا ہے“ (بیان القرآن تاج پبلشرز، دہلی، بدون تاریخ، ص ۸۰۶۔۸۰۷)۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قرآن کی نظر میں پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ چلنے میں بیچ کی راہ اختیار کی جائے، بہت تیز بھاگ دوڑ اور بہت سست روی دونوں سے گریز کیا جائے۔ بلاشبہ سنجیدگی اور وقار کا تقاضا بھی یہی ہے۔

آیت کے دوسرے حصہ سے آواز کے بارے میں یہ ہدایت ملتی ہے کہ بولنے میں اسے پست رکھا جائے، یعنی بات چیت کرنے میں بہت چیخا چلایا نہ جائے، اس لیے کہ یہ حدّ اعتدال سے تجاوز کرنا ہے، اس سے سامع کو تکلیف ہوتی ہے اور یہ شائستگی کے بھی خلاف ہے۔ اس آیت کی تشریح میں بعض مفسرین نے بجا طور پر یہ وضاحت کی ہے کہ آواز اتنی پست بھی نہ ہو کہ سنی نہ جائے اس لیے کہ یہ بھی اعتدال کے منافی ہے۔ اس سے پہلے آیات واحادیث کے حوالہ سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ نماز یا نماز کے باہر قراءت قرآن اور ذکرِ الٰہی میں بھی متوسط آواز مطلوب ومحمود ہے۔

کھانے پینے میں اعتدال سے کام لینے اور غذا میں کمیت وکیفیت دونوں اعتبار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے توازن برتنے کی تعلیم قرآن وحدیث سے ملتی ہے۔ اس باب میں اللہ رب العزت کا یہ ارشاد اوپر گزر چکا ہے:

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف ۷/۳۱) کھاؤ اور پیو اور اسراف نہ کرو

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ اسراف میں حد سے زیادہ یا ضرورت سے زیادہ کھانا یا کسی چیز کا استعمال کرنا سب کچھ شامل ہے۔ گرچہ اس آیت سے عام معنی میں مال و دولت اور ساز وسامان کے استعمال میں فضول خرچی کی ممانعت مراد لی جاتی ہے، لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کے حوالہ سے اسراف کی اقسام میں واضح طور پر کھانے پینے میں حد سے تجاوز کرنے یعنی ضرورت سے زیادہ اور ضرورت سے کم کھانے دونوں کو شامل کیا ہے۔ معارف القرآن کے مولفِ گرامی مولانا مفتی محمد شفیعؒ مذکورہ بالا آیت کی تشریح میں اسراف کی مختلف صورتوں کو ذکر کرنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

''اسی طرح یہ بھی اسراف ہے کہ بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے۔ اسی لیے فقہاء نے پیٹ بھر سے زائد کھانے کو ناجائز لکھا ہے۔ (احکام القرآن)۔ اسی طرح یہ بھی اسراف کے حکم میں ہے کہ باوجود قدرت واختیار کے ضرورت سے اتنا کم کھائے کہ جس سے کمزور ہو کر ادائے واجبات کی قدرت نہ رہے'' (معارف القرآن، مکتبہ مصطفائی، دیوبند، بدون تاریخ، ۳/۵۴۵)۔

مزید براں اس کی تائید میں انھوں نے حضرت فاروقؓ کا یہ قول نقل بھی کیا ہے کہ ''بہت کم کھانے سے بچو، کیوں کہ وہ جسم کو خراب کرتا ہے اور، بیماریاں پیدا کرتا ہے، عمل میں سستی پیدا کرتا ہے، بلکہ کھانے پینے میں میانہ روی اختیار کرو کہ وہ جسم کی صحت کے لیے مفید ہے اور اسراف سے دور ہے''۔ یہاں یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن القیم نے اپنی مشہور کتاب ''الطب النبوی ﷺ'' میں کھانے پینے میں مختلف قسم کی بے اعتدالی سے جسمانی نظام میں جو خرابی وفساد پیدا ہوتا ہے اس پر تفصیل سے بحث کے بعد آخر میں سورہ اعراف کی مذکورہ آیت کے حوالے سے لکھا ہے: ''اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ بدن میں کھانے پینے کی اس قسم کو داخل کرو جو بدل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تا تحلیل ہو سکے اور کھانے پینے کی مقدار و کیفیت ایسی ہو جو بدن کو نفع پہنچا سکے۔ اس سے جہاں آگے بڑھا تو اسراف کا شکار ہوا اور یہی دونوں چیزیں صحت کے لیے مضر اور بیماری کا باعث ہیں، یعنی بالکل نہ کھانا پینا یا کھانے پینے میں اسراف'' (ابن قیم الجوزیہ، طب نبوی ﷺ، اردو ترجمہ حکیم عزیز الرحمن اعظمی، الدار السلفیہ، بمبئی، ۱۹۹۴ء، ص ۴۰۶)۔

روزمرہ زندگی کی خوش گواری اور معاشرتی امن و امان میں جذبات و احساسات کو قابو میں رکھنے اور ان کے اظہار میں توازن و اعتدال کا بہت بڑا دخل ہے۔ اس کے برخلاف اس باب میں عدمِ توازن اور بے اعتدالی سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور معاشرہ میں جو فساد و بگاڑ آتا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ انسان کے جذبات غصہ کی حالت میں سب سے زیادہ برانگیختہ ہوتے ہیں اور زیادہ تر وہ اسی کیفیت میں اپنے توازن کو کھو بیٹھتا ہے اور اور بے قابو ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں وہ ایسی حرکتیں کر ڈالتا ہے جو خود اس کے لیے وجہِ پشیمانی اور باعث مضرت بنتی ہیں اور دوسروں کے لیے بھی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ جذبات میں عدم توازن کے مظاہرہ اور اس کے مہلک انجام کی پہلی مثال ہابیل و قابیل کے واقعہ سے دی جاتی ہے کہ قابیل اپنے بھائی کی قربانی کی بارگاہِ الٰہی میں مقبولیت اور اپنی عدمِ مقبولیت پر غصہ کی آگ میں وہ ایسا بھڑک اٹھا کہ اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور توازن کو کھو بیٹھا، جس کا نتیجہ بھائی کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ قرآن کریم میں غصہ کو پی جانے یا اس حالت میں اپنے کو قابو میں رکھنے کی تعلیم بڑے موثر انداز میں دی گئی ہے اور وہ اس طور پر کہ غصہ پی جانے والوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان نیک بندوں میں شامل کیا ہے جن کے لیے جنت تیار کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

سَارِعُوٓا۟ إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ. الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے حصول کے لیے آگے بڑھو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کی طرح ہے۔ یہ پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو کشادگی و تنگی ہر حال میں [اپنا مال] خرچ کرتے ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو غصہ کو ضبط کرنے والے اور جو لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ نیکو کاروں کو پسند فرماتا ہے (آل عمران:۳/۱۳۳۔۱۳۴)

اس آیت کے حوالے سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ تبصرہ بڑی اہمیت رکھتا ہے: ''غیظ وغضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی برائی ہے۔ بہت سے ظالمانہ و بے دردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم و پشیمان ہوتا ہے۔ اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے'' (سیرۃ النبی ﷺ، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۰۳ء، ۶/۴۵۶)۔ اس کے علاوہ ایک دوسری آیت میں اہلِ ایمان کے امتیازی خصائص میں کبائر گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائی کی باتوں سے اجتناب، اللہ کی دعوت پر لبیک کہنے اور نماز کے اہتمام کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ وہ غصہ کی حالت میں معاف کر دینے والے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ملاحظہ ہو:

فَمَآ اُوتِيتُم مِّن شَيءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ. وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ. وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ

اور جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا وہ تو دنیا کی زندگی کا ساز و سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر اور پائدار ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں اور بڑے بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائی سے بچتے ہیں اور جب غصہ ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں اور جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا اور نماز کا اہتمام کیا (الشوریٰ:۴۲/۳۶۔۳۸)

ان آیات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن کی نظر میں غصہ کو ضبط کرنے، اس حالت میں اپنے کو قابو میں رکھنے اور توازن و اعتدال کا دامن تھامے رہنے کی کتنی اہمیت ہے کہ اسے اہلِ ایمان کی ان خصوصیات میں ذکر کیا گیا ہے جو ان کی شناخت ہوتی ہیں اور جن پر اللہ تعالیٰ نے انھیں جنت نصیب کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ غصہ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حالت میں انسان کیسی کیسی غلط حرکتیں اور تباہ کن کام کرڈالتا ہے، بخوبی معلوم ہے۔ اس حالت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھنا یعنی معتدل رویہ اختیار کرنا اور بری حرکتوں یا غلط اقدام سے باز رہنا آسان کام نھیں ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کے اس پر حکمت قول کی معنویت سے کون انکار کرسکتا ہے: قال رسول اللہ ﷺ ما تعدون الصرعة فیکم قالوا الّذی لا یصرعه الرجال۔ قال ولکنه الّذی یملك نفسه عند الغضب [کتاب الادب باب من کظم غیظاً](پہلوان وہ نھیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ دے، بلکہ (اصل) پہلوان وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے کو قابو میں رکھے۔ اس ضمن میں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ غصہ کی حالت میں منفی جذبات پر کیسے قابو پایا جائے اور مزاج کو کس طرح معتدل رکھا جائے، اس کا طریقہ بھی معلمِ انسانیت حضور اکرم ﷺ نے بتایا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے دو اصحاب کو غصہ کی حالت میں دیکھا جن کا چہرہ اس کی وجہ سے سرخ ہو گیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک ایسا کلمہ ہے جسے اگر کوئی پڑھے تو اس کا غصہ جاتا رہے، صحابہ نے دریافت کیا: وہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم (جامع ترمذی، کتاب الادب، بابما یقال عند الغضب)۔ اس دعا کی حکمت صاف واضح ہے کہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس حالت میں اسے خوب بہکانے کا موقع ملتا ہے، اس لیے جب کسی کو غصہ آئے اور اس کے جذبات برانگیختہ ہونے لگیں تو فوراً اس سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہیے۔ خود قرآن کریم سے یہی ہدایت ملتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَإِمَّا يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ	اور جب شیطان تمھیں اکسائے تو اللہ
فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ	کی پناہ چاہو۔ بے شک وہ سننے والا اور
(الاعراف: ۷/۲۰۰)	جاننے والا ہے

غصہ پر قابو پانے کے لیے مذکورہ دعا کی حکمت اس حدیث سے اور واضح ہو جاتی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتی ہے، تو جس کو غصہ آئے اسے چاہیے کہ وہ وضو کرلے (سنن ابو دائود، کتاب الادب، باب مایقال عند الغضب)۔ ان سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے علاوہ نبی کریم علیہ ﷺ نے غصہ پر قابو پانے کی ایک نفسیاتی ترکیب بھی بتائی اور وہ یہ کہ جب کسی کو غصہ آئے تو بیٹھ جائے، اگر اس پر بھی فرو نہ ہو تو لیٹ جائے (سنن ابو داؤد، کتاب الادب، باب ما یقال عند الغضب)۔ مقصود یہ کہ کیفیت کی تبدیلی سے ذہن بٹ جائے گا اور غصہ کم ہو جائے گا۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ غیظ و غضب کے عالم میں انسان ایک اور جس منفی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے وہ اپنے حریف یا دشمن (جس نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہے) سے انتقام یا بدلہ لینا ہے یا اس پر بھرپور وار کرنا ہے۔ قرآن کریم اس اشتعالی کیفیت میں بھی صبر و ضبط سے کام لینے اور انتقامی کاروائی میں حد سے زیادہ نہ گزر جانے کی ہدایت دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ (النحل:۱۶/۱۲۶)	اور اگر بدلہ لو تو بس اتنا ہی جتنا تمھیں نقصان پہنچایا گیا ہو اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے

اس آیت میں یہ بات خاص طور سے قابلِ غور ہے کہ مخالف یا دشمن کی زیادتی کے برابر بدلہ لینے کی اجازت کے ساتھ یہ حقیقت بھی منتقم کے ذہن میں بٹھائی گئی ہے کہ اگر وہ بالکل ہی معاف کر دے تو اسی میں اس کے لیے خیر ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر ایسی صورت میں انتقام لینے اور اس میں حد سے تجاوز کرنے کی نوبت ہی نھیں آئے گی۔ کسی کے خلاف جنگ یا انتقامی کاروائی کے سلسلہ میں زیادتی کرنے یا حد سے آگے بڑھنے کی ممانعت کے باب میں قرآن کی یہ آیت ایک اصولی ہدایت دیتی ہے:

فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ (البقرہ:۲/۱۹۴)	پس جو تم پر زیادتی کرے ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ ان کے ساتھ ہے جو اس کے حدود توڑنے سے ڈرتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آیت کے آخر میں اللہ رب العزت سے ڈرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے بخوبی یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن کی نظر میں انتقامی کاروائی میں کس درجہ احتیاط مطلوب ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلاَ تَعْتَدُوا إِنَّ اللّٰهَ لاَ يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (المائدہ/۸۷)	اور حد سے آگے نہ بڑھو، بے شک اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا

دوستی و دشمنی اور محبت و نفرت میں بھی اعتدال کی راہ اپنانے اور حد سے نہ بڑھنے کی تعلیم قرآن و حدیث سے ملتی ہے۔ بلا شبہ مخالفت و عداوت میں حد سے تجاوز کرنے کے بڑے نقصانات ہوتے ہیں۔ اس کا ایک بہت بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ مخالف یا دشمن کے تئیں عداوت و نفرت کے جذبات جب حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں تو انسان حق و انصاف کے تقاضوں کو پامال کر بیٹھتا ہے، یعنی عدل وانصاف کے فطری اصولوں سے منہ پھیر لیتا ہے۔ قرآن کریم میں کسی کی دشمنی میں حد سے تجاوز کرنے کی ممانعت اس طور پر کی گئی ہے کہ دیکھو اس حالت میں جذبات اس درجہ برانگیختہ نہ ہونے پائیں کہ دشمن کے ساتھ کوئی ناانصافی کا معاملہ ہو جا آئے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَلاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلاَّ تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى (المائدہ: ۸/۵)	اور کسی کی دشمنی تمھیں اس بات پر نہ برانگیختہ کردے کہ تم ناانصافی کر بیٹھو۔ [ہر حال میں] انصاف کا معاملہ کرو، یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے

ایک دوسری آیت میں اس سے بھی زیادہ واضح لفظوں میں دشمنی میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی ھدایت دی گئی ہے۔ جو لوگ اہلِ ایمان کو خانہ کعبہ میں داخلہ اور عبادت سے روکیں مومنین کا ان سے بدترین دشمن کون ہو سکتا ہے، لیکن ان کے حوالے سے بھی اہل ایمان کو یہ تاکید کی جارہی ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَن تَعْتَدُواْ (المائدہ:۵/۲)

اور تمھیں اس قوم کی دشمنی جس نے تمھیں مسجد حرام سے روکا اس بات پر نہ بر انگیختہ کردے کہ تم [ان کے ساتھ] زیادتی کرو

اسی معاملہ سے متعلق حضرت علیؓ کے اس قول میں عملی زندگی کے لیے بڑی حکیمانہ نصیحت مضمر ہے:

احبب حبیبک هوناً ما عسیٰ ان یکون بغیضک یوماً ما و ابغض بغیضک هوناً ما عسیٰ ان یکون حبیبک یوماً ما (جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب الاقتصاد فی الحب والبغض)

(اپنے دوست سے دوستی میں میانہ روی اختیار کرو، ممکن ہے وہ کسی دن تمہارا دشمن بن جائے۔ اور اپنے دشمن سے دشمنی میں اعتدال برتو ہوسکتا ہے وہ کبھی تمہارا دوست ہو جائے)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کٹر سے کٹر مخالفین اور سخت ترین دشمنوں کے ساتھ عفوو درگذر اور رحم وکرم کا جو معاملہ فرمایا اس کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نھیں ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس کی وضاحت میں متعدد واقعات بیان کیے ہیں (سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ۲/۲۸۶۔۲۹۰، ۲۹۷۔۲۹۹)۔ ان کے حوالے سے سید صاحب نے جو تبصرہ فرمایا ہے وہ بہت قیمتی وقابلِ نقل ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''انسان کے ذخیرۂ اخلاق میں سب سے زیادہ کم یاب، نادر الوجود چیز دشمنوں پر رحم اور ان سے عفوو درگذر ہے، لیکن حاملِ وحی ونبوت کی ذات اقدس میں یہ جنس فراواں تھی۔ دشمن سے انتقام لینا انسان کا قانونی فرض ہے، لیکن اخلاق کے دائرۂ شریعت میں آکر یہ فرضیت مکروہ تحریمی بن جاتی ہے۔ تمام روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے انتقام نھیں لیا'' (سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، ۲/۲۸۶)۔

خوشی وغم کے مواقع بھی انسان کے لیے سخت آزمائشی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کیفیات میں جذبات واحساسات کو قابو میں رکھنا اور ان کے اظہار میں معتدل رہنا بڑا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشکل کام ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ خوشی وغم کی حالت میں توازن واعتدال قایم نہ رکھنے پر حکمِ الٰہی اور سنت رسول ﷺ کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور دوسروں کو اس سے تکلیف بھی پہنچتی ہے اور بعض اوقات تو جان و مال کا نقصان بھی ہو جاتا ہے، جیسا کہ آئے دن اس کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ قرآن وحدیث میں اس صورت حال میں اعتدال وتوازن پر قایم رہنے اور ان کیفیات کے اظہار میں حد سے تجاوز نہ کرنے کی واضح ہدایت ملتی ہے۔ اس حالت میں قرآن نے اس پہلو سے صبر وضبط اور توازن واعتدال کی تعلیم دی ہے کہ جو بھی نعمت یا کوئی خوشی نصیب ہوتی ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہوتا ہے، اس لیے اس حالت میں بہت زیادہ خوش ہونے واترانے اور جذبات میں بہہ جانے کے بجائے منعمِ حقیقی کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ دوسرے دنیوی مال ودولت اور جاہ ومنصب آنی جانی یا فانی ہے، اس پر اترانے اور بہت زیادہ مگن ہونے کے کیا معنی۔ اسی طرح جو مصیبت یا پریشانی آتی ہے یا کسی کو کوئی نقصان پہنچتا ہے وہ بھی اللہ کی مرضی سے۔ تو اس صورت میں بہت زیادہ آہ واویلا کرنے اور مایوسی کی کیفیت میں ڈوب جانے کے بجائے چاہیے کہ انسان صبر کرے اور اللہ ہی سے رجوع کرے اور اس حالت میں بھی اللہ کا شکر ادا کرے، اس لیے کہ اس کے خزانہ میں کسی چیز کی کمی نھیں۔ اس ضمن میں یہ آیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے:

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (الحدید: ۲۳/۵۷)	تاکہ تم شکستہ دل نہ ہو اس پر جو تم سے فوت ہو جائے اور اتراؤ نہ اس پر جو تمھیں مل جائے اور اللہ کسی غرور وگھمنڈ کرنے والے کو پسند نھیں کرتا

حقیقت یہ کہ خوشی وشادمانی کے موقع پر اترانا وغرور کرنا اور آپے سے باہر ہو جانا اور اسی طرح پریشانی ودکھ کی صورتِ حال سے دوچار ہو کر رنج وغم میں بالکل گھل جانا اور مایوسی کی کیفیت میں مبتلا ہو جانا، یہ دونوں باتیں توازن واعتدال کے منافی ہیں اور ناشکری کی علامت ہیں۔ اللہ اسے پسند نھیں فرماتا، جیسا کہ اس آیت سے صاف واضح ہوتا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَؤُوسٌ كَفُورٌ. وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاء بَعْدَ ضَرَّاء مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّيْ إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ

(هود:۱۱/۱۰۔۱۱)

اور اگر ہم انسان کو اپنے فضل سے نوازتے ہیں، پھر اس سے اس کو محروم کردیتے ہیں تو وہ مایوس اور ناشکرا ہوجاتا ہے۔اور اگر کسی تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی، اس کو نعمت سے نوازتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میری مصیبتیں دفع ہوگئیں ۔ اور وہ اکڑنے والا اور شیخی بگھارنے والا بن جاتا ہے

واقعہ یہ کہ مال ودولت ملنے یا خوشی کا کوئی اور موقع نصیب ہونے پر فخر وغرور کا مظاہرہ کرنا نہ صرف اللہ کی ناراضگی کا باعث ہوتا ہے بلکہ اس کے بندے بھی اسے سخت ناپسند کرتے ہیں۔قارون جب اپنی کثیر دولت پر اترانے وگھمنڈ کرنے لگا تو اس کی قوم نے اس پر ناگواری ظاہر کی۔ارشاد ربانی ہے:

إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ (القصص:۲۸/۷۶)

جب اس کی قوم نے اس (قارون) سے کہا: مت اتراؤ، اللہ اترانے والوں کو پسند نہیں فرماتا

اس آیت کے حوالہ سے مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ اظہار خیال بہت اہم معلوم ہوتا ہے کہ: انسان کو جن چیزوں پر مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں ۔ مال ودولت، علم وفضل، عہدہ ومنصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہارِ مسرت کے سیکڑوں مواقع پیش آتے ہیں، لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر وغرور سے مل جاتی ہے" (سیرۃ النبی ﷺ، ۶/۵۴۷)۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب مادی یا معنوی نعمت ملنے پر مسرت کا موقع ہو تو اللہ کا شکر ادا کیا جائے اور کوئی نقصان ہوجائے یا کوئی پریشانی یا دکھ لاحق ہو تو صبر کا من پکڑا جائے اور اس حالت میں بھی اللہ کی حمد بجالائی جائے، اس لیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعتدال کا تقاضا یہی ہے۔ شکر و صبر کے باب میں قرآنی تعلیمات کے لیے مثال کے طور پر یہ آیات ملاحظہ کی جاسکتی ہیں: (البقرہ:۲/ ۴۵، ۱۵۲۔۱۵۳، ۱۷۲، ۲۴۳؛ الاعراف: ۷/ ۱۰، ۸۷؛ یونس: ۱۰/ ۶۰؛ ھود: ۱۱/ ۱۱۵؛ النحل: ۱۴/ ۷، ۱۲۷؛ النمل: ۲۷/ ۴۰؛ لقمان: ۳۱/ ۱۷؛ الدھر: ۷۶/ ۲۴؛ المعارج: ۷۰/ ۵) ۔ نبی کریم ﷺ کے اس معمول سے اس تعلیم کی مزید وضاحت ملتی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب کبھی نبی کریم ﷺ کو کوئی خوشی نصیب ہوتی تو آپ ﷺ یہ دعا پڑھتے: الحمد لله، بنعمته تتمّ الصالحات (سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، اسی کے حکم سے تمام بھلائیاں مکمل ہوتی ہیں) ۔ اور جب کوئی غم یا یا پریشانی لاحق ہوتی تو آپ ﷺ یوں فرماتے: الحمد لله علیٰ كلّ حال (ہر حال میں اللہ ہی کی تعریف ہے) (محمد ابن عبد الوہاب، مختصر زاد المعاد لابن قیم رترجمہ مقتدیٰ حسن ازہری، الدار السّلفیہ، بمبئی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۶۴) ۔

مختصر یہ کہ مذکورہ بالا آیات و احادیث کی تشریح و ترجمانی سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے کسی ایک نہیں، بلکہ تمام پہلوؤں (عبادات، اخلاقیات، سماجیات، معاشیات و معاملات) میں اعتدال و توازن دین اسلام میں مطلوب ہے۔ حقیقت یہ کہ قرآن کریم میں جس چیز کو صراط مستقیم کہا گیا ہے اور جس کے لیے ہر نماز میں ہم دعا مانگتے ہیں، اسی پر چلنے کا نام اعتدال ہے۔ اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی پوری حیات مبارکہ اسی کی عملی تعبیر پیش کرتی ہے۔ یہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ تبصرہ نقل کرنا بہت برمحل معلوم ہوتا ہے:

”حقیقی اعتدال اتباع سنت کا دوسرا نام ہے۔ ہم میں اعتدال نہ ہونے کا سبب اتباع سنت کا اہتمام نہ ہونا ہے۔ نماز روزہ تو بڑی چیز ہے، رسول اللہ ﷺ کے تو ہر فعل میں اعتدال و انتظام تھا۔ نشست و برخاست میں، خورد و نوش میں، گفتار و رفتار میں۔ اسی کو حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: کان خلقه القرآن کہ قرآن میں جو امور مذکور ہیں وہ آپ ﷺ کے لیے طبعیہ عادیہ کے ہوگئے تھے“ (اسلام کی تعلیمات میں اعتدال، ماہنامہ راہِ اعتدال۔ اعتدال نمبر، ۲۲/ ۶، اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۳۲) ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلاصہ یہ کہ زندگی کے ہر معاملہ میں اسی صراط مستقیم یا راہ اعتدال کو اختیار کرنے میں خیر وفلاح ہے اور اس کو چھوڑ دینا یا بے اعتدالی کی راہ پر چلنا موجبِ وبال ونقصان اور باعثِ فساد وتباہی ہے۔ برادر مکرم پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے: ''بے اعتدالی ایک مہلک مرض ہے۔ یہ مرض جس فرد، گروہ اور قوم کو لاحق ہو جائے وہ صراط مستقیم سے بھٹک جاتی ہے اور اپنی تباہی کا سامان خود ہی فراہم کرنے لگتی ہے۔ یہ صرف قوتِ حیات ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ مدتِ حیات بھی مختصر کر دیتی ہے'' (اعتدال۔ اسلامی شریعت کا مزاج، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۱۰)۔

واقعہ یہ کہ اسلام اور اسلامی شریعت کی یہی (ہر معاملہ میں اعتدال) وہ خصوصیت ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہیں، یعنی اس مذہب میں کسی بھی پہلو سے متشدد رویہ اپنانے یا کسی بھی معاملہ میں حد سے تجاوز کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا اپنے کو خطرہ میں ڈالنا ہے اور دوسروں کو بھی تکلیف سے دوچار کرنا ہے اور اسلام کسی صورت میں نہ اسے پسند کرتا ہے اور نہ اس کی اجازت دیتا ہے۔

اللہ کرے ہمیں قول سے زیادہ عمل سے دنیا کے سامنے اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کی توفیق نصیب ہو۔ آمین ثم آمین۔

© rasailojaraid.com